قرآن شناسی:

مولانا سید علی محمد نقوی

تفسیر سورہ الحمد

الفاتحہ کا مفہوم تعارف یا افتتاح ہے۔ یہ سورہ بنیادی طور پر مقدمہ قرآن ہے اور اس کا نزول بھی عہد رسالت کے بالکل ابتدائی دور میں ہوا ہے۔ یہ پہلا سورہ ہے جو مکمل نازل ہوا۔ اس سورہ سے پہلے سورہ نمبر ۹۶، ۷۳، اور ۷۴ کی چند ابتدائی آیتیں نازل ہو چکی تھیں۔ یہ تنہا سورہ ہے جو عہد رسالت کے دونوں ادوار یعنی مکی دور اور مدنی دور میں الگ الگ دوبارہ نازل ہوا اور اس طرح مکی اور مدنی دونوں کہلایا۔ اس سورہ کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی واجب نماز اس سورہ کی قرأت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہر باعمل مسلمان اپنی روزانہ کی واجب نمازوں میں کم سے کم دس مرتبہ اس سورہ کی تلاوت ضرور کرتا ہے۔ اس کی آیتوں کی ترتیب اور الفاظ کی نشست بلند ترین شعری ادب کا نمونہ ہے۔ اس کا صوتی تاثر عربی زبان کا بے مثل انداز اور مضمون کی گہرائی انسان کو معنویت کے اعلیٰ ترین مقامات تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ چھوٹا سا سورہ انسان کی خداوند جلیل کے حضور ایک دعا ہے جسے خالق نے خود تعلیم کیا ہے۔ قرآن چونکہ بنیادی طور پر کتاب ہدایت ہے اور ہدایت خالق کا اپنے بندوں پر ایک کرم ہے لہٰذا یہ کتاب دعا سے شروع ہوتی ہے جس میں انسان اپنے رب سے ہدایت کی درخواست کرتا ہے۔ پورا قرآن درحقیقت انسان کی اسی درخواست کا جواب ہے۔

سورہ فاتحہ کا موازنہ عیسائیوں کی دعای رب'' (Lord's Prayer) سے کیا جاسکتا ہے۔ دونوں کا فرق بہت واضح ہے۔ انجیل کی دعا میں خداوند کریم کو ''پدر'' باپ کے نام سے

یاد کیا گیا ہے جبکہ سورہ فاتحہ اسے ''عالمین کے رب'' سے تعبیر کرتا ہے۔ انجیل کی دعا میں خالق کے لئے ''جو آسمانوں میں ہے'' کی لفظیں استعمال کی گئیں ہیں۔ جبکہ سورہ فاتحہ اسے ''تمام دنیا اور آخرت کا مالک'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ انجیل کی دعا میں انسان اپنے رب سے اپنے قرضوں کی ادائگی اور روٹی کا سوال کرتا ہے جبکہ اس سورہ میں انسان صراط مستقیم پر چلنے اور قائم رہنے کی ہدایت کا مطالبہ کرتا ہے۔

یہ سورہ اپنے معنیٰ اور مضمون میں اس قدر جامع ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پورے قرآن کا نچوڑ اس سورہ کی سات آیتوں میں سمویا ہوا ہے۔ سات چھوٹی آیتوں کا یہ چھوٹا سا سورہ درحقیقت اسلام کے تمام بنیادی عقاید کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اس لئے اسے جائز طور پر ''اُم القرآن'' کہا جاتا ہے ۔ یہ سورہ اسلامی طرز فکر کے تمام اجزاء کو صریحاً یا اشارتاً بیان کرتا ہے یہاں ہم کچھ پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جنکا مجمل ذکر اس سورہ میں موجود ہے

تصور خدا:

- اس سورہ میں خداوند تعالیٰ کے چار بنیادی صفات بیان کئے گئے ہیں یعنی خالق' رب' رحیم' اور یوم جزا کا مالک۔اسلام میں یہی تصور خدا ہے یعنی ایسا خدا جس کی قدرت اور حکومت لامتناہی اور جس کا رحم وکرم تمام حدود سے بالاتر ہے۔وہی کائنات کا خالق اور اس کا پالنے والا ہے۔

صفات الٰہی کا بیان :

- رحمانیت ، رحمت اور عدل خداوند عالم کی وہ بنیادی صفات ہیں جن کی طرف اس سورہ میں اشارہ ہے۔

عقیدہ معاد:

اسلام کا دوسرا اہم عقیدہ عقیدہ معاد یا قیامت ہے اس سورہ کے آخر میں اسلام کے

تصور معاد (قیامت) کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خداوند عالم یوم قیامت کا مالک ہے۔ یعنی ایک دن ایسا ہوگا جب عدل وانصاف کیا جائے گا اور انسان اپنے اعمال کی سزا یا جزا پائے گا اور کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہی اسلام کا تصور معاد یا قیامت ہے۔

عقیدہ توحید:

عقیدہ توحید اسلام کا جوہر ہے۔ اسلامی توحید صرف نظریہ نہیں بلکہ ایک عملی نظام ہے۔ سورہ حمد میں اس کا ذکر ہے۔

- اور کہا گیا ہے کہ انسان کو صرف اللہ کی عبادت کرنی چاہئے اور صرف اس سے مدد کی امید رکھنی چاہئے۔

عقیدہ نبوت وامامت:

- اسلام کے دوسرے بنیادی عقیدے عقیدہ نبوت وامامت میں فلسفہ موت وحیات اور ضرورت ہدایت الٰہی ہے۔ سورہ حمد میں اس کی بنیاد کا تذکرہ ہے اور اس بات پر تاکید کی گئی ہے کہ انسان خدا کی ہدایت کا محتاج ہے۔

نظریہ تولا

- انسان کو اچھوں کے ساتھ رہنا چاہئے اور بروں اور برائی سے نفرت کرنا چاہئے اور ان سے اپنے دامن کو دور رکھنا چاہیے۔

سورہ حمد میں اس اصول کا بھی دعائیہ پیرایہ میں ذکر ہوا ہے۔ اس طرح سورہ حمد میں صرف توحید، معاد، نبوت، امامت، اخلاق اور احکام کی جانب اشارہ نہیں ہے بلکہ انسان اور کائنات کے اسلامی تصور اور اسلامی عملی نظام کی جانب بھی رہنمائی موجود ہے۔ اسی لئے سورہ فاتحہ کو پورے قرآن کا نچوڑ کہا جاتا ہے۔

بسم اللہ کے معنیٰ اور اس کی اہمیت:

"بسم اللہ" سورہ برأت کو چھوڑ کر قرآن کے تمام سوروں کا جزو ہے۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ پیغمبر اکرمؐ پر جب بھی کوئی نیا سورہ نازل ہوتا تھا تو سب سے پہلے آیت بسم اللہ نازل ہوتی تھی بغیر "بسم اللہ" کے یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نیا سورہ شروع ہوگیا ہے (داؤد) امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی معاویہ ابن عمار کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن امام سے سوال کیا کہ کیا مجھے نماز میں سورہ حمد سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی تلاوت کرنی چاہئے، امام نے فرمایا ہاں" میں نے پھر سوال کیا کہ کیا سورہ حمد کے اختتام اور دوسرے سورہ کے شروع کرنے سے پہلے پھر "بسم اللہ" پڑھنا چاہئے، امام نے پھر فرمایا ہاں۔" دار قطنی نے امیر المومنین سے روایت کی ہے کہ کسی نے آپ سے "سبع مثانی" (سات آیتوں) کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا یہ سورہ حمد ہے۔ اس شخص نے پھر کہا کہ سورہ حمد میں تو صرف چھ آیتیں ہی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" بھی تو ایک آیت ہے۔

"بسم اللہ" کی اہمیت اور فضیلت کے سلسلے میں امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ نے فرمایا: "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اسم اعظم ہے اس طرح ہم سے قریب ہے جیسے آنکھ کی پتلی اس کی سفیدی سے۔ شیخ صدوق نے کتاب "خصائل" میں امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ ہم جب بھی کوئی چھوٹا یا بڑا کام شروع کریں تو ہمیں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے اس کام کی شروعات کرنی چاہئے۔ اس سے رحمت خدا اس کام میں شامل ہوجاتی ہے۔

روایتوں میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ سورہ حمد پورے قرآن کا نچوڑ ہے، "جو کچھ سورہ حمد میں ہے وہ "بسم اللہ" میں ہے اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے وہ باء بسم اللہ میں ہے، جو کچھ باء بسم اللہ میں ہے وہ اس نقطہ میں ہے جو "باء" کے نیچے لگتا ہے اور جو اس حرف کو دوسرے عربی حروف سے جدا کرتا ہے۔" یہ جملہ بہت گہرا ہے اور اس کے عرفانی معانی ہیں۔ اسی لئے

امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے فرمایا ''میں وہ نقطہ ہوں جو ''باء'' کے نیچے ہوتا ہے۔''

اگر ہم اس آیۂ مبارکہ پر گہرائی سے غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اسلام کا مرکزی پیغام اس ایک جملے میں سمو دیا گیا ہے۔ ہر آئیڈیالوجی اور مکتب فکر کا اپنا ایک نعرہ ہوتا ہے جو اس کے بنیادی پیغام کو پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کے انقلاب کا نعرہ تھا ''برابری آزادی اور اخوت'' جو اس تحریک کے پیغام کی طرف متوجہ کرتا تھا اسی طرح مارکس کی تحریک کا نعرہ تھا ''دنیا کے مزدورو متحد ہوجاؤ۔'' یہ نعرہ اس آئیڈیالوجی کے طبقاتی طرز فکر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ قرآن کریم کی شروعات ''بسم اللہ'' سے ہوتی ہے جو اسلامی آئیڈیالوجی کے لئے ایک بنیادی شعار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیت سے یہ ثابت ہے کہ اسلامی طرز فکر میں بنیادی حیثیت نہ تو نسل کی ہے نہ رنگ کی نہ ہی طبقہ کی بلکہ ان تمام چیزوں سے بالاتر ذات واجب الوجود اور اس کے مقدس قوانین ہیں جو اس مذہب کی بنیاد ہیں۔ اس طرح '' آیہ بسم اللہ'' اسلامی نظام کا ایک علامتی شعار ہے۔

''بسم اللہ'' سے کام شروع کرنے کی حکمت:

ہر مسلمان کے لئے یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کی شروعات '' آیت بسم اللہ'' سے کرے۔ یہ جملہ در اصل خداوند عالم سے مدد کی درخواست پر مبنی ہے۔ اسلام بنیادی طور پر صرف ایک فلسفیانہ نظام نہیں ہے جہاں عمل کی گنجائش ہی نہ ہو بلکہ اس دین میں عقیدہ اور عمل ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ اس لئے آیۂ ''بسم اللہ'' نہ صرف ایک عقیدہ کا اعلان ہے بلکہ ساتھ ہی اس میں عمل کی ترغیب بھی ہے۔

رب العالمین کے حقیقی معنیٰ اور اس کے مختلف پہلو:

رب کے مختلف معنیٰ ہیں جیسے:(۱) مالک، آقا اور صاحب اختیار (۲) پالنے والا، کفیل اور ولی (۳) بادشاہ اور حاکم (۴) وہ جس کی اطاعت واجب ہو (۵) رازق، اور ترقی دینے والا (۶) وہ جو مسلسل کمال کی جانب رہنمائی کرے۔

لفظ ''رب'' خالق اور کائنات کے بیچ رشتے کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ یہ نہ صرف خلق کرنے اور وجود میں لانے کی جانب اشارہ کرتا ہے بلکہ کائنات کے تکامل اور ترقی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ مادی کائنات خود بہ خود پیدا نہیں ہوگئی ہے اور نہ از خود چل رہی ہے۔ اللہ نہ صرف کائنات کا خالق ہے بلکہ اس کا چلانے والا بھی ہے۔ کائنات سے خالق کا رشتہ کوئی گذشتہ واقعہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ ارسطو کے فلسفۂ ''علت اول'' اور اسلامی تصور ''رب العالمین'' میں یہی فرق ہے۔

خداوند نہ صرف خالق ہے بلکہ وہ اپنی مخلوق کو ان میں موجود استعداد کے ذریعہ کمال کی جانب رہنمائی بھی کرتا ہے۔ کائنات کی ہر شئی ہر لحہ ترقی پذیر ہے یہ آیت اس جانب بھی اشارہ کرتی ہے کہ انسان کی ترقی کے امکانات لامحدود ہیں لہٰذا رب العالمین حیات اُخروی میں بھی منازل کمال کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان کی روحانی ترقیاں مرگ ظاہری کے بعد بھی جاری رہیں گی۔

لفظ ''اللہ'' کے معنیٰ:

''اللہ'' لفظ الٰہ'' کے ساتھ ''ال'' لگا کر بنایا گیا ہے۔ یہ خدا کا اسم ذات ہے۔ دوسری زبانوں میں اس لفظ کے مساوی جتنے بھی الفاظ پائے جاتے ہیں ان کی جمع اور مؤنث ممکن ہے لیکن لفظ ''اللہ'' کے لئے جمع یا مؤنث ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ انگریزی زبان میں ''گاڈ'' یا اردو میں ترجمے کے لئے ''خدا'' کا استعمال کیا جاتا ہے مگر درحقیقت لفظ اللہ کا صحیح ترجمہ کسی بھی زبان میں ممکن نہیں ہے۔

''العالمین'' کے معنیٰ:

''عالمین'' کے کیا معنیٰ ہیں؟ کیا ایک سے زیادہ دنیائیں موجود ہیں؟ کیا اسکے معنیٰ تمام موجودات ہیں؟ کیا اسکے معنیٰ مختلف مخلوقات اور ان کے مراتب ہیں؟ تفسیر ''المنار'' کے مصنف نے اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں امامؑ نے

فرمایا کہ ''عالمین'' سے مراد تمام انسان ہیں۔ شیخ صدوق نے اپنی کتاب ''عیون الاخبار'' میں امیر المومنین حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا ''عالمین'' سے مراد تمام مخلوقات ہیں چاہے وہ ذی روح ہوں یا بے جان۔ اگر ہم قرآن کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں یہ لفظ مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں پر یہ تمام مخلوقات یعنی انسان، ارواح، ملائکہ، حیوانات، درخت اور معدنیات کے لئے استعمال ہوا ہے تو کہیں پر محدود معنی میں جیسا کہ آیۂ (۲۵:۲) میں ''العالمین'' سے مراد تمام انسان ہیں۔ کہیں پر اس سے مراد تمام گروہ ہیں۔

اسلام ایک آفاقی دین:

قرآن اپنے آغاز ہی میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح کر دینا چاہتا ہے کہ دین اسلام میں ذات خدا کسی ملک یا نسل کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ اسلام کا تصور ''رب'' کسی قبائلی دیوتا یا علاقائی خدا کا تصور نہیں ہے۔ اسلامی نظریئے سے اللہ تمام کائنات اور تمام انسانیت کا مالک اور رازق ہے۔

خالق کی وحدانیت کا لازمی نتیجہ مخلوق کا اتحاد ہے۔ اسلام کی صفات میں ایک مخصوص صفت اس کا آفاقی ہونا ہے۔ دین اسلام یہودیت یا عیسائیت کی طرح کسی خاص قوم یا گروہ کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام زرتشتی یا ہندو مذہب کی طرح نسلی مذہب بھی نہیں ہے جو صرف ایک خاص نسل یعنی آریائی نسل کے لئے مخصوص ہو۔ اسی طرح اسلام طبقاتی آئیڈیالوجی (مثلاً مارکس ازم کی طرح) بھی نہیں ہے جو صرف ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص ہے۔ اسلام اپنے نقطۂ آغاز ہی سے ایک آفاقی دین تھا۔ اسی لئے قرآن نے خدا کو ''تمام دنیا کے مالک'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

رحمٰن اور رحیم کا مفہوم:

''رحمٰن و رحیم'' ایک ہی مادہ رحمت سے مشتق ہیں۔ اسلام کا مقصد چونکہ انسان کو

"خدا محوری" کی جانب لے جاتا ہے اسی وجہ سے بنیادی طور پر ان دو صفتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً اسی سے محبت کرتا ہے جو خود لطف و کرم اور محبت کرنے والا ہو۔ یہ دو صفات خود بہ خود انسان کی توجہ اسکے حقیقی خالق کی طرف موڑ دیتی ہیں اور اس سے محبت کا باعث بنتی ہیں

"الرحمٰن" اور "الرحیم" دونوں کے معنی بہت مہربان اور بہت رحم کرنے والے کے ہیں۔ چونکہ انسانی زبان اللہ کے رحم و کرم کو بیان کرنے سے قاصر ہے اس لئے پے در پے "لفظوں کا استعمال کیا گیا اس کے علاوہ "رحمٰن اور رحیم" کے الفاظ میں لطیف فرق بھی ہے جس کا علماء نے تذکرہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل فرق کا تذکرہ مفسرین نے کیا ہے۔

(۱) "رحمٰن" عربی صرف کے لحاظ سے "فعلان" کے وزن پر ہے جو صفت رحم کے نقطہ کمال کے لئے استعمال ہوتی ہے جبکہ "رحیم" بر وزن "فعیل" ہے جو اس صفت کے مستقل اور مسلسل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی 'رحمٰن' کامل ترین لطف و محبت کو بیان کرتا ہے اور "رحیم" لطف مسلسل کو۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ رحمان اس مادی دنیا میں اللہ کے عام لطف و کرم کے لئے اور رحیم آخرت میں اس کے مومنین پر مخصوص رحمت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ

(۳) "رحمٰن" اللہ کی اس عمومی محبت اور لطف کو بیان کرتا ہے بلا کسی قید کے انسانوں کے شامل حال ہے۔ خواہ وہ مومن ہو یا کافر، اچھا ہو یا برا، جبکہ رحیم اس کی اس صفت رحم کا نام ہے جو اسکے مطیع اور نیک اعمال کرنے والے بندوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس آیت سے ایک اور اہم نکتہ کا استنباط ہوتا ہے۔

کائنات اور اس کے خالق میں کس قسم کا رشتہ ہے؟ قرآن اشارہ فرماتا ہے یہ رشتہ لطف و محبت ہے جس کے تحت اللہ نے کائنات کو خلق کیا اور کائنات قائم ہے۔ یہ لطف الٰہی ہی

ہے جو دنیا میں انسانی وجود کی بنیاد ہے۔ بعثت انبیاء کا محرک بھی لطف الٰہی ہے۔ یہ سوال ذہن میں آتے ہیں کہ کائنات کو کیوں پیدا کیا گیا ؟ کیوں اسے تکامل کی جانب ہدایت کی گئی ؟ پیغمبروں کو کیوں مبعوث کیا گیا ؟ امامت کا سلسلہ کیوں قائم ہے۔ ان تمام سوالوں کا ایک ہی جواب ہے یعنی اللہ کا لطف عدم کی گہرائیوں سے مخلوق کے وجود کو باہر لانے کا اصل محرک یہی لطف الٰہی ہے جو درحقیقت تمام موجودات کی وجہ خلقت ہے۔ اسی لئے سورہ حمد میں چار بار ان صفات کو دہرایا گیا ہے۔

''رحیم'' اللہ کی اس محبت اور مہربانی کی طرف اشارہ ہے جو اس کے مخصوص، اور پاک بندوں سے مخصوص ہے۔ ''رحمٰن'' صفت ''ربوبیت'' سے متصل ہے اور ''رحیم'' ''مالک یوم الدین'' سے۔ اللہ کا عمومی رحم پوری کائنات کے لئے ہے مگر چونکہ اس نے انسانوں کو قوت اختیار اور قوت فیصلہ عطا کی ہے تاکہ وہ صحیح یا غلط، ہدایت یا گمراہی میں سے کسی ایک راہ کو چن لیں اس لئے جو لوگ راہ ہدیات کا اتباع کریں گے ان کے لئے مخصوص اجر ہے جو اس ''رحیم'' کی صفت سے ظاہر ہے۔

روز جزا وعدل الٰہی اور تصور معاد:

اس آیت میں عدل الٰہی کے اصول کی جانب اشارہ ہے۔ قرآن کریم کے مطابق لطف ورحم خداوند عالم کی اولین صفات ہیں مگر چونکہ اسلام ایک حقیقت پسند دین ہے جس میں نہ تو عیسائیت کی طرح جذبہ لطف ومحبت کو مرکزیت حاصل ہے اور نہ ہی یہودیت کی طرح صفت عدل ہی پر سارا دار ومدار ہے۔ اس لئے اسلام خداوند قدوس کی ان دونوں صفات کا تذکرہ کرتا ہے۔ پہلے رحم پھر اس کے بعد عدل۔ دیکھا جائے تو یہ دونوں صفات درحقیقت وجود کائنات کے اہم اسباب وعوامل ہیں۔ قرآن کے مطابق خالق کائنات نہ صرف لطیف ورحیم ہے بلکہ عادل بھی ہے۔ لہٰذا انسان کو نہ صرف اس سے محبت کرنی چاہئے بلکہ اس کے جلال اور عدل کی وجہ سے اس سے ڈرنا بھی چاہئے۔ یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ ''رحمٰن ورحیم'' کے

لفظ کو دوبارہ دہرایا گیا، پھر صفت عدل کا ایک بار ذکر ہوا جس سے آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کائنات اور انسان کے معاملات میں اللہ کی دونوں صفات یعنی رحم اور عدل کا کیا تناسب ہے۔

اس دعا کی خاصیت یہ ہے کہ یہ دل کو چھو لینے والے انداز میں انسان کو اس کے رب کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ انسان کی فطرت میں دو ہی جذبے ایسے ہیں جو اسے سر تسلیم جھکا دینے پر مجبور کردیتے ہیں محبت یا خوف۔ کچھ لوگ محبت میں اپنا سر جھکا دیتے ہیں تو کچھ خوف کی بنا پر۔ اس دعا میں اولاً ان صفات الٰہی کا ذکر ہے جن کا تعلق لطف و محبت سے ہے اور بعد میں وہ صفات ہیں جو جذبہ خوف کو بیدار کرتی ہیں اور دونوں صفات کا یکے بعد دیگرے تذکرہ کرنے کے بعد خالق کے عفو و کرم کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ اس کی قدرت مطلقہ کے دائرہ اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے معاف کرے یا جس پر چاہے لطف و کرم کی بارش کرے وہ ایسا قاضی نہیں ہے جس کا کام صرف مجرمین کے لئے سزا تجویز کرنا ہو۔

عدل الٰہی:

اس آیت میں عدل الٰہی کی طرف اشارہ اس اصول کی اہمیت کا غماز ہے۔ اللہ کی جملہ صفات میں عدل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ متکلمین نے اسے توحید کے بعد دوسرا بنیادی عقیدہ تسلیم کیا ہے۔ عدل الٰہی سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم کے نظام کائنات، قانون سازی اور جزا و سزا میں اصول عدل کارفرما ہے۔ خداوند ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے پاک و مبرا ہے۔ کیونکہ کسی بھی قسم کا ظلم ہر ذی شعور کے نزدیک نقص ہے۔ اور اللہ ہر نقص سے پاک و آزاد ہے لہذا اس کا عادل مطلق ہونا واجب و لازم ہے۔

انسان صاحب اختیار اور اپنے اعمال کے لئے ذمہ دار مخلوق ہے۔ اللہ اسے اس کے اعمال کی جزا دے گا جو از لحاظ اصول عدل مناسب ہوگی۔ شیعہ متکلمین نے نظریہ عدل پر اتنا زور اس لئے دیا کیونکہ مسلمانوں کے اندر ہی ایک فرقہ "اشاعرہ" کے نام سے وجود میں

آ گیا تھا جس کا نظریہ یہ تھا کہ اللہ اصول عدل پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں ہے۔ اسے یہ اختیار ہے کہ کسی بدترین مخلوق کو جنت عطا کرے اور ایک بندۂ صالح کو جہنم میں بھیج دے۔ شیعوں کا عقیدہ اس سے بالکل مختلف ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر پہلو اور جہت سے نہ صرف ذات اکمل بلکہ منبع کمال ہے اور ہر طرح کا ظلم نظریہ کمال کے منافی ہے لہذا وہ عادل مطلق ہے۔ علاوہ از ایں شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ''خیر وشر حقیقی ہیں اور انسان اپنے تمام اعمال وافعال کی انجام دہی کے لئے صاحب اختیار ہے۔ اگر انسان اپنے اعمال وافکار میں صاحب اختیار نہ ہوتو جنت وجہنم کا وجود بے معنی ہوجاتا ہے اور اگر اللہ برائیوں پر جزا اور نیکیوں پر سزا دے تو اخلاقیات پر عمل کرنے کا کوئی محرک باقی نہیں رہتا ہے۔

نظریہ عدل کا ایک رخ اجتماعی اور سیاسی انصاف بھی ہے۔ اسی لئے شیعیت میں اصول عدل کو اپنی ذاتی اور معاشرتی زندگی میں جاری کرنے کی تاکید نظر آتی ہے۔ یہ اصول قرآن کریم کی واضح آیات اور مستند احادیث معصومین سے ماخوذ ہے۔

دین کے معنی:

لفظ دین جزا اور 'مذہب' دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ روز قیامت کو روز جزا بھی کہتے ہیں کیونکہ اس دن صالحین اور مجرمین دونوں کو ان کے اعمال کی پوری جزا ملے گی۔ اسی کو یوم دین بھی کہتے ہیں کیونکہ اس دن انسان کی آنکھوں کے سامنے سے تمام مادی حجابات اٹھ جائیں گے اور وہ اپنے آپ کو تمام حقائق کے روبرو پائے گا۔ دین خود حقیقتوں کے انعکاس کا نام ہے۔

یہ آیت اسلامی جہاں شناسی کے دوسرے اہم عقیدے کی جانب اشارہ کرتی ہے یعنی آخرت پر ایمان۔ جہاں بینی اسلامی کے مطابق کائنات اور انسان صرف مادی وجود میں محدود نہیں ہیں۔ انسانی زندگی ظاہری موت کے بعد بھی جاری رہنے والی ہے۔ اور ہر فرد بشر روز قیامت اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار اور خدا کے نزدیک ان کا جواب دہ ہوگا۔ لفظ دین اس

قانون معاد اور احتساب کی جانب اشارہ کرتا ہے جو کائنات میں جاری وساری ہے۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم:

اس آیت میں خطاب غیب سے حضورؐ کی جانب مڑتا ہے۔یعنی ابھی تک جو طرز کلام تھا اس میں مخاطب حاضر نہیں تھا جبکہ اب سیدھے خداوند عالم کو مخاطب کر کے جملے ادا ہورہے ہیں۔چونکہ ہم اپنے وجود کے ہر پہلو میں ذات واجب کے محتاج ہیں اس لئے ہمیں وہ راستہ بتایا جارہا ہے جس کے ذریعے حقیقی سعادت اور عظمت حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ راستہ عبادت اور اللہ سے استعانت یعنی طلب امداد کا راستہ ہے۔عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کمال خضوع کے ساتھ اپنے پورے وجود کو سراپا اطاعت بنادے۔

لفظ عبادت کے تین معنی مراد لئے جاتے ہیں۔

(۱) بندگی اور تعظیم

(۲) اطاعت اور خودسپردگی

(۳) خدمت اور انکساری

اسلام میں مفہوم عبادت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔عبادت صرف چند احکام ورسوم وارکان کے بجالانے میں محدود نہیں ہے۔اسلام کے مطابق کسی فرد یا گروہ کا ہر وہ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا عمل جو خوشنودیٔ خدا یا مرضیٔ خدا کے مطابق انجام دیا جائے عبادت میں داخل ہے۔درحقیقت مرضی خدا پہ چلنے والے مومنین کی حیات کا ہر لحہ مفہوم عبادت کی عملی تفسیر ہے۔

توحید عبادت:

قرآن یہ نہیں کہتا کہ ''ہم تیری عبادت کرتے ہیں'' بلکہ کہا جارہا ہے' ہم صرف اور صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔'' یہ جملہ خود توحیدی مفہوم عبادت کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے۔انسان اللہ کی توحید کا اقرار کرتے ہی دوسرے تمام جھوٹے اور خودساختہ خداؤں

اور ان کی بندگی سے ہمیشہ کے لئے آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اب اس اقرار کے بعد اسے کسی دوسرے کے در پر اپنی پیشانی رکھنے یا اس کے غضب سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

توحید مطلق کا یہی تصور اسلام کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ کیتھولک چرچ میں تین قسم کی عبادتیں ہیں (۱) خدا کے لئے (۲) حضرت مریم کے لئے (۳) خاصان خدا کے لئے۔ اسی طرح ہندو مذہب میں اندرا، اگنی، سوما، اور نہ جانے کتنے دیوی، دیوتا ہیں جن کے لئے مخصوص عبادتیں انجام دی جاتی ہیں۔ لیکن دین اسلام میں عبادت صرف اور صرف ذات رب العزت ہی کے لئے مخصوص ہے جس میں کوئی نبی بھی شریک نہیں ہے۔

توحید افعال:

نہ صرف یہ کہ ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں بلکہ ہر قسم کی مدد اور استعانت کے لئے بھی صرف اللہ کی جانب ہی رجوع کرتے ہیں۔

چونکہ اسلام عقیدے اور عمل کے مجموعے کا نام ہے لہذا چند نظری جملوں کے بعد قرآن پھر عمل کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ صرف کسی شئی کو مان لینا فلسفہ ہے مگر اس عقیدے کے مطابق عمل کرنا مذہب ہے۔ دین اور فلسفے میں یہی فرق ہے اور یہی فرق ایک پیغمبر اور فلسفی میں ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہمیں صرف اللہ کی عبادت کرنی چاہئے بلکہ اسی سے مدد بھی طلب کرنی چاہئے یہی اسلام کا توحیدی طرز فکر ہے جو انسانی حیات کو عبادات اور اعمال کے خانوں میں نہیں بانٹتا بلکہ انہیں ایک کر کے دیکھتا ہے۔ اسلامی طرز فکر کے مطابق خدا محوری ہمارے تمام اعمال وافعال کا بنیادی اصول ہونا چاہئے چاہے وہ اعمال دنیاوی ہوں یا اخروی۔ مزید برآں ذات باری تعالیٰ ہی ہماری تمامتر عقیدتوں اور امیدوں کا مطمع نظر ہونا چاہئے۔

یہ آیہ کریمہ در اصل عقیدۂ توحید کے عملی پہلو کی رہنمائی کر رہی ہے۔ ایک مسلمان کی پوری حیات قربت الٰہی کے حصول کی سعی پیہم میں بسر ہونی چاہئے۔ اس کی محبت عقیدت،

اعمال یہاں تک کہ اس کی موت وحیات بھی صرف اسی معبود حقیقی کے لئے مخصوص ہونی چاہئے۔ یہی اسلام میں توحید عملی کا تصور ہے۔

ہدایت کا مفہوم اور اس کے مختلف پہلو:

انسان کا مقصد زندگی کیا ہے؟ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے لازوال کامیابی اور فلاح حاصل کرلینا۔صراط مستقیم سے مراد ایسا راستہ ہے جو ہموار اور سیدھا ہو جس میں ناہمواری اور مشکلات نہ ہوں اور جس پر بہ آسانی چلا جا سکے۔ اسی کو ہم سچا راستہ کہتے ہیں۔صراط مستقیم کو حاصل کرنا ہر مسلمان کا مقصد حیات ہے۔ اسی لئے اسلامی اصطلاحات میں یہ اصطلاح زبان زد خلائق ہے۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ صراط مستقیم کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔؟ یہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب انسان اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ سے ہدایت طلب کرتا رہے۔ اللہ نے بنی نوع انسان کے سر پر عقل کا تاج کرامت رکھا ہے مگر فلاح اور کامیابی کے لئے اکیلے انسانی شعور اور عقل ناکافی ہے جب تک ہدایت اور توفیق الٰہی بھی شامل نہ ہو جائے۔ اسلامی نظریہ معرفت اور عقل پرستی میں یہی فرق ہے۔ وہاں ہر شئی کو پرکھنے کا معیار عقل ہے جبکہ یہاں انسانی سعادت وکامیابی اور فلاح کے لئے وحی الٰہی اور نبوت بھی ضروری ہے۔ یہ معبود کا اپنے بندوں پر لطف ہے کہ اس نے ان کی ہدایت کے لئے ایک آئین یعنی قرآن کو وحی کے ذریعے نازل کیا۔

ہدایت سے مراد صرف راستہ دکھا دینا نہیں ہے بلکہ اس وقت تک رہنمائی کرنا ہے جب تک انسان اپنی منزل مقصود تک نہ پہنچ جائے۔ انسان معبود کی استعانت کے بھروسے سیدھے اور سچے راستے پر چلنے اور فلاح کے ساحل سے ہمکنار ہونے کی دعا کررہا ہے۔ لفظ ہدایت مختلف سطح پر مختلف معنی ہے کا حامل ہے (۱) سچا راستہ دکھانا (۲) سچے راستے کی جانب رہنمائی کرنا (۳) سچے راستے پر قائم رکھنا۔ اسی سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ اولیاء اللہ یا آئمہ طاہرین ''اھدنا الصراط المستقیم'' کیوں کہتے تھے؟ اس جملے سے ان کی مراد یہ ہوتی

تھی کہ "پالنے والے ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھ۔ یہ آیت قرآن کریم کے نزول کے بنیادی مقصد اور جوہر کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے کہ قرآن کا نزول صرف اس کی عزت وتکریم کرنے کے لئے ہرگز نہیں ہوا ہے بلکہ اس کتاب کا مقصد نزول یہ ہے کہ کاروان انسانیت کو اس کی منزل آخر کا پتہ بتاتے ہوئے اس منزل کی طرف جانے والے سیدھے راستے کی نشاندہی کرے۔ اس کے نازل ہونے کا اولین مقصد بنی نوع انسان کی ہدایت کرنا ہے تا کہ وہ ضلالت اور گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر لطف الٰہی کے نور کو اپنے قلب میں محسوس کر سکے۔

نبوت وامامت اور اسلامی فلسفۂ تاریخ:

اسلام کے بنیادی اصولوں یعنی توحید، معاد، عدل الٰہی، تصور انسان اور جہاں بینی کے تذکرے کے بعد سورہ حمد اب اسلامی فلسفۂ تاریخ اور عقیدہ نبوت وامامت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اسلامی تصور انسان یہ ہے کہ اسے قدرت نے اختیار اور قوت فیصلہ جیسی صفات سے متصف کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے ذمہ دار اور اپنے اعمال کے لئے جواب دہ بھی قرار دیا ہے۔ جو لوگ اپنے اختیار سے راہ ہدایت کا انتخاب کرتے ہیں وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ وہ لوگ جو گمراہی اختیار کرتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ جو اس لئے گمراہ ہوئے کہ سیدھے راستے تک پہنچ نہ سکے، دوسرے وہ جو جان بوجھ کر انکار کرنے کے باعث اللہ کے غضب کے مستحق بنے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کی شناخت کے باوجود اس کا انکار کرتے اور گمراہی کے فروغ کے لئے عملاً کام کرتے ہیں۔ ہدایت یافتہ اور گمراہ گروہ کے درمیان مسلسل جنگ کا نام تاریخ ہے۔ تاریخ کے وسیع طول وعرض میں اہل حق اور اہل باطل مسلسل ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہابیل وقابیل سے لیکر آج تک اسی انداز میں جاری ہے۔ "جو لوگ ہدایت نہیں پا سکے" وہ ایسے عوام ہیں جن کا تیسرے اہل باطل گروہ نے استحصال کیا حق وباطل کی طاقتوں کے بیچ یہ معرکہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک حق کو آخری فتح اور

باطل کو شکست مطلق نصیب نہ ہو جائے۔ اس جنگ میں ہر فرد بشر کو ان دونوں میں سے ایک گروہ کو اختیار کرنا پڑیگا۔ انسان کو ہر وقت یہ دعا کرنا چاہئے کہ اللہ اپنے بے پایاں لطف وکرم سے اسے اس گروہ میں شامل کرے جو اسکے نیک اور ہدایت یافتہ بندوں کا گروہ ہے نہ کہ ان میں جن پر اس کا غضب نازل ہوا ہے۔

اللہ نے انسان کو قوت اختیار دینے کے باوجود ہدایت کی تلاش میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑا بلکہ اپنے لطف ورحم کے تقاضے کے مطابق انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کا سلسلہ شروع کیا۔ تاریخ انسانی کے اس طویل سفر میں ہر منزل پر انبیاء، اوصیاء اور اولیاء اللہ انسان کو اس کی حقیقی رہگزر کا پتہ بتانے کے لئے ظاہر ہوتے رہے۔ انسان کا فرض ہے کہ ان سے محبت اور ان کی اتباع کی سعی پیہم کرتا رہے۔

سچا راستہ آخر کیا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جو روز اول سے پوچھا جارہا ہے۔ یہ نہ فرعون اور قارون جیسے دنیا پرستوں کا راستہ ہے اور نہ ہی کوئی خواب وخیال کی دنیا۔ یہ صاحبان دولت قوت کا راستہ نہیں بلکہ صالحین اور متقین کا راستہ ہے۔آج کے مادی نظریہ اور اسلامی طرز فکر میں یہی فرق ہے۔ یہ دنیا کے روحانی قائدین کے نقش قدم ہیں جن پر ایک مسلمان چلنا چاہتا ہے اور اس کا ہدف زندگی صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا نہیں۔ بلکہ دوسروں کے روحانی ارتقاء کے لئے بھی سخت جدوجہد کرتا ہے۔ اسی لئے وہ دعا کرتا ہے کہ خداوند عالم حق کو ثابت اور باطل کو نابود کرنے میں متقین کی مدد واعانت فرمائے۔

رسول اکرمؐ اور آئمہ طاہرین کی متعدد احادیث میں آیا ہے کہ'' انبیاء کرام اور آئمہ اہل بیت کا راستہ ہی صراط مستقیم ہے۔'' آنحضرتؐ نے فرمایا ''صراط مستقیم انبیاء کا راستہ ہے اور یہ وہی حضرات ہیں جن پر اللہ نے اپنی رحمتیں نازل کی ہیں۔'' ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔'' خدا کی قسم ہم اہل بیت ہی صراط مستقیم ہیں۔'' یعنی اہلبیت کی ہدایات کے مطابق چل کر ہی صراط مستقیم اور نجات تک رسائی ممکن ہے۔

حدیث ثقلین سے جو حضور اکرمؐ کی مشہور و معروف احادیث میں شامل ہے، اس مضمون پر مزید روشنی پڑتی ہے جس میں کہا گیا ہے: (اے لوگو) میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان دونوں سے منسلک رہو گے تو ہر گز گمراہ نہیں ہو گے۔ انہیں سے ایک اللہ کی کتاب (یعنی قرآن) ہے اور دوسرے میری عترت، میرے اہل بیت" ابن مغازلی نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا "میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے۔ جو اس میں داخل ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے منحرف ہوا وہ غرق ہو گیا۔"

اس دعائیہ سورے کے آخر میں امید اور خوف دونوں عناصر سامنے آتے ہیں رحمتوں کا بھی تذکرہ ہے اور غضب کا بھی فرمایا جا رہا ہے "ہمیں سچے راستے کی ہدایت فرما، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنی رحمتیں نازل کی ہیں نہ کہ ان کا جن پر تو نے اپنا غضب نازل کیا اور جو گمراہ ہیں۔"

وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ کون ہیں جو گمراہ ہیں؟ بعض احادیث میں آیا ہے کہ یہ لوگ یہودی اور عیسائی ہیں۔ قرآن بھی عیسائیوں کو "گمراہ ہو گئے۔" (۵:۷۷) سے تعبیر کرتا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "جن لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوا وہ یہودی ہیں اور جو لوگ گمراہ ہو گئے وہ عیسائی ہیں (ترمذی ۴۴:۲) لیکن چونکہ قرآن ایک کتاب ہدایت ہے جو تمام زمانوں کے لئے ہے لہٰذا نامناسب ہے کہ اسکی کسی آیت کو کسی خاص واقعہ یا قوم ہی سے منسوب کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں یہ دو گروہ موجود رہے ہیں۔ پہلا گروہ جو رہبران باطل ہیں جو حق کے شدید ترین مخالف ہیں جبکہ دوسرا گروہ عوام کا ہے جو اسی پہلے گروہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا ہے اور اس گروہ میں شامل گمراہ لوگ "ضالین" کے مصداق ہیں۔

عقیدہ امامت کی طرف اشارہ:

امامت وہ عقیدہ ہے جس کے مطابق چند ہستیاں ایسی ہیں جنہیں اللہ نے پیغمبر اسلامؐ کا جانشین قرار دیا ہے ان کا فریضہ دین اور شریعت اسلام کی پاسبانی اور صحیح تفسیر وتوضیح اور روحانی مذہبی، معاشرتی ، اور سیاسی معاملات میں امت کی قیادت ہے۔لغت کے اعتبار سے امام کے معنی قائد کے ہیں۔شیعہ اصطلاح کے مطابق امام منصوص من اللہ اور پیغمبرؐ کے ذریعے تعارف شدہ وہ شخصیتیں ہیں جن کا فریضہ امت اسلامیہ کی قیادت ہے ہر مسلمان پر امام کی اطاعت اور محبت واجب ہے۔

مقصد امامت:

پیغمبر اسلامؐ کے دنیا میں تشریف لانے اور قرآن کے واضح اعلان کے بعد کہ آپؐ عی اللہ کے آخری پیغمبرؐ ہیں۔نبوت اپنے نقطہ اختتام تک پہنچ گئی یعنی اب آنحضرت کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا نبیؐ نہیں آئے گا۔مگر قرآن واحادیث کی صحیح توجیہ وتفسیر اور بدلتے وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے امت کی قیادت کا کام یقیناً باقی رہے گا۔چونکہ سنت الٰہی یہ ہے کہ مشیت کبھی مخلوق کی کسی ضرورت کو تشنہ نہیں چھوڑتی اور ہر مخلوق کو اس کے کمال تک پہچانے کے وسائل فراہم کرتی ہے لہٰذا اس کی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ نبوت کے بعد بھی انسانیت کی ہدایت کے لئے انتظام موجود ہو۔جس طرح اللہ نے اپنی وحی اور پیغام رسانی کے لئے مخصوص بندوں کا انتخاب کیا اور انہیں عصمت ومعجزہ جیسی قوتیں عطا فرمائیں اسی طرح اس پیغام اور شریعت کی حفاظت کرنے والے اور قرآن وسنت رسولؐ کی صحیح تفسیر کرنے والے آئمہ کرام کو بھی اس نے خود منتخب کیا اور اس امر کو امت کے انتخاب پر نہیں چھوڑا اور انہیں بھی عصمت وکرامات سے آراستہ کیا۔ اگر وحی الٰہی کی توضیح میں خطا اور نسیان کے امکانات باقی رہیں گے تو پوری امت کے ایک ساتھ گمراہ ہوجانے کا خطرہ بھی برقرار رہے گا۔قدرت نے

اسی مقصد ہدایت کو جاری رکھنے کے لئے آئمہ کا انتخاب کیا۔ امام کا منصوص من اللہ ہونا اس لئے ضروری ہے کیونکہ اگر لوگ خود اپنا روحانی پیشوا اور ہادی چنیں گے تو اس انتخاب میں خطا ہونے کے پورے امکانات ہوں گے۔ چونکہ انسان خود معصوم اور خطاؤں سے پاک نہیں ہے لہٰذا اس کا انتخاب بھی ان نقائص سے پاک نہیں ہوسکتا۔ اس غلط انتخاب کا نتیجہ دین کی ناقص تشریح کی صورت میں سامنے آئیگا۔ ساتھ ہی ساتھ امام کو معصوم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر اس میں خطا اور نسیان کے امکانات ہوں گے تو پھر امت کی گمراہی کا خطرہ پیدا ہوگا جو عدل الٰہی اور فیضان الٰہی کے فلسفے کے خلاف ہے۔ اسی طرح امام کو منجانب اللہ عالم بھی ہونا چاہئے تا کہ وہ پیغام الٰہی کی مشیت کے مطابق تفسیر کر سکے۔ مختصراً اسے اپنے زمانے کی کامل ترین شخصیت ہونا چاہئے کیونکہ یہ خدا کی حکمت اور عدالت کے خلاف ہے کہ وہ کسی ناقص انسان کو قیادت اور رہبری کے لئے منتخب کرے۔

کیونکہ لطف وفیض الٰہی قابل انقطاع نہیں اور ہدایت الٰہی کی ضرورت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اس لئے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی وقت ایسا ممکن ہی نہیں ہے جب ایک امام موجود نہ ہو (حالانکہ آج وہ پردۂ غیب میں ہیں) امام معصوم، اللہ کی جانب سے علم رکھنے والا اور پیغمبر حضرت محمدؐ کے بعد انسانیت کا کامل ترین فرد ہوتا ہے۔

عقیدہ تولیٰ وتبرّا:

سورہ حمد کی آخری آیت سے نظریہ تولی وتبرا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تولی یعنی ہمیں ان لوگوں سے محبت اور ان کی پیروی کرنا چاہئے جن پر اللہ نے خصوصی انعام نازل فرمایا ہے یعنی انبیاء خصوصاً ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰؐ اور آئمہ اہلبیتؑ۔ تبرا یعنی ہمیں ایسے لوگوں سے اظہار برأت اور نفرت کرنا چاہئے جو اللہ کے دین، اس کے پیغمبروں خصوصاً حضرت محمد مصطفیٰؐ اور اہلبیت کے دشمن ہیں۔ یہی بات اس آیت میں کہی گئی ہے۔

قرآن کریم اور احادیث پیغمبرؐ کے مطابق ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ محمدؐ اور آل محمدؐ

سے دوستی اور محبت رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہوا: (اے نبی لوگوں سے) کہئے کہ ہمیں تم سے کوئی اجرت نہیں چاہئے جز میرے قرابتداروں سے محبت کے (۴۲:۲۳)

پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا: وہ اہلبیت سے محبت ایمان کی اور ان سے عداوت کفر کی علامت ہے جو کوئی ان سے محبت کرتا ہے گویا وہ خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور جو کوئی ان سے دشمنی رکھتا ہے گویا وہ خدا اور اسکے رسولؐ سے دشمنی رکھتا ہے۔"

اہلبیت اطہار سے محبت ایک دینی فریضہ ہے جس پر مسلمانوں کے تمام فرقوں کا اتفاق ہے سوائے چند لوگوں کے جنہیں دشمنان اہل بیت رسول گنا جاتا ہے اور جنہیں "نواصب" (یعنی وہ جو اہلبیت کے لئے اپنے دلوں میں دشمنی رکھتے ہیں) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے ایک بنیادی عقیدے سے انکار کیا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ صرف اہلبیت کے لئے دل میں محبت رکھنا ہی کافی نہیں ہے جب تک کہ اس میں اطاعت اور پیروی کا عنصر بھی شامل نہ ہوجائے۔ انہیں کے بارے میں پیغمبرؐ کا ارشاد ہے:

"میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو ان سے منحرف ہوا وہ ہلاک ہوگیا۔" یہاں سوار ہونے کا تذکرہ ہے۔

سفینۂ نوح کی ہی طرح اس کشتی میں بھی جو سوار ہوا وہ اللہ کی امان کے سائے میں پہنچا اور جو پیچھے رہ گیا وہ شک وشبہات کی متلاطم موجوں میں غرق ہوکر ہلاکت کے گھاٹ اترا۔

اسی لئے عقائد واحکام کے تمام مسائل میں ہمیں انہیں ہستیوں کی جانب رجوع کرنا چاہئے کیونکہ انہیں کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے: "میں تمہارے درمیان دوگراں قدر چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ اللہ کی کتاب قرآن اور میرے اہلبیت اگر تم ان دونوں سے وابستہ رہوگے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ اللہ کی کتاب ایک مضبوط رسی ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان (رابطے کے لئے) لٹکائی گئی ہے۔ یاد رکھو یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں

ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر مجھ سے ملاقات کریں۔'' یہ حدیث بلاتفریق مسلک تمام کتب احادیث میں پائی جاتی ہے اور شیعہ سنی تمام محدثین کا اس پر پورا اتفاق ہے۔ اپنی بلاغت کے اعتبار سے بھی یہ حدیث ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ حدیث کے پہلے جملے میں پیغمبرؐ فرمارہے ہیں کہ میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں جبکہ بعد کے جملے میں دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کے بتارہے ہیں کہ در اصل یہ دونوں ایک ہی ہیں جو کبھی جدا نہیں ہوسکتے۔ پیغمبرؐ یہ فرمارہے ہیں کہ نجات کے لئے دونوں سے وابستگی لازم ہے اس لئے کہ یہ دونوں درحقیقت ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے، یہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انسان ان میں سے کسی ایک کا دامن تھام کر دوسرے کو چھوڑ دے تو وہ کبھی راہ ہدایت حاصل نہ کرسکے گا۔ اس لئے یہ حضرات سفینۂ نوح کے مانند ہیں۔

☆☆☆☆